مولانا محمد حنیف ندوی

۱۹۵۸ء کا انقلاب اور اس کے فکری پہلو

حکمرانوں کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے؟ علم السیاسۃ کی ایک قدیم بحث ہے۔ افلاطون کی رائے میں صرف حکما اور فلسفہ و دانش کے ماہرین ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ زمامِ اقتدار سنبھالیں اور کاروبارِ سیاست کو خوش اسلوبی سے چلائیں اور شاید اسی نقطۂ نظر کی بنا پر "تاریخ مادیت" کے مشہور مصنف لینج (Lange) نے انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان کو دیکھ کر اس تحسین آفرین اچنبھے کا اظہار کیا تھا کہ یہاں کے ارباب سیاست نظم و نسق کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے پہلو بہ پہلو فلسفہ و حکمت کی گتھیوں کو سلجھانے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔

ہماری رائے میں فلسفہ و سیاست کے میدان الگ الگ ہیں، اور بالکل مختلف اور جدا جدا تقاضوں کے طالب ہیں۔ جہاں سیاست زندگی کی گہما گہمیوں اور طوفان خیزیوں سے دوچار ہے، اور عملی بصیرت اور تجربہ کی گہرائیاں چاہتی ہے، وہاں فلسفہ و دانش کی فطرت خلوت و تجرید کی حامی ہے اور غور و تعمق کی فراوانیوں کی متقاضی ہے، اور یہ انیسویں صدی کے انگلستان کا کمال سمجھنا چاہیے کہ اس نے اپنے دامن میں اس تضاد کی پرورش کی، ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ فلسفہ کا شغف سیاسیات کو چوپٹ کر کے رکھ دیتا یا سیاسیات کی مصلحتیں فکر و ادراک کے معروضی اسلوب کو ملیامیٹ کر ڈالتیں۔ اس پر حیرت کا اظہار نہ کیجیے یہ واقعہ ہے کہ اس عجیب و غریب ملک کی تاریخ فکر و عمل کے بہت سے تضادات اور اعجوبوں کو کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ ورنہ عام حالات میں دونوں کی راہیں قطعی علیحدہ اور مختلف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا افلاطون کے اس نظریہ میں قطعی کوئی سچائی پائی نہیں جاتی؟ نہیں! اس میں اس حد تک معقولیت کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے کہ کسی بھی سیاسی تنظیم میں جب تک مخصوص فلسفہ حیات کی جھلک نہ ہو، مخصوص تعمیری فکر نمایاں نہ

ہو، متعین اندازنہ ہوں، غرض وغایت واضح اور سمجھ میں آنے والی نہ ہو، اس وقت تک اس کی کامیابی نہ صرف مشکوک ہوتی ہے بلکہ اس کے پنپنے اور پروان چڑھنے میں ملک و ملت کا زیان بھی ہے۔

آیئے اس لحاظ سے پاکستان کی دس سالہ ترقیات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا ان کے پیچھے واقعی کوئی فلسفۂ حیات کارفرما ہے، اور ان کے پس منظر میں حقیقتاً فکر و دانش کے صحت مند پیمانوں کی چھنک سنائی دیتی ہے، یا ان کی بنیاد و اساس ایسے معروضی نظریات پر استوار ہے جو زندگی، ارتقا اور خوش حالی و کامرانی سے براہِ راست تعلق رکھنے والے ہوں۔ ہم اس مضمون میں یہ نہیں بتائیں گے ۵۸ کے انقلاب نے ملک کو کس درجہ استحکام بخشا ہے، اس سے ملک اور بیرونِ ملک میں ہمارا وقار کتنا بڑھا ہے، اور کس طرح خدا خدا کر کے سوءِ ظن کے دل بادل چھٹے ہیں اور اعتماد، دوستی اور خیر سگالی کی خوش گوار فضا پیدا ہوئی ہے۔ ہم قابلِ فخر زرعی ترقی کی بات بھی نہیں کریں گے۔ ان عظیم آبی ذخائر کا ذکر بھی نہیں چھیڑیں گے جن سے اس وقت پاکستان کا چپہ چپہ گل بداماں ہے اور یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ صنعت و حرفت کے ارتقا نے ان دس سالوں میں ہماری صنعتی اور تکنیکی صلاحیتوں کو کس درجہ اجاگر کیا ہے۔ یا زرمبادلہ کے حیرت انگیز اضافے نے ہماری مالی ساکھ کو بڑھانے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ یہ ساری بحثیں ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔

ہمیں جو کچھ کہنا ہے اس کا تعلق دوررس نتائج کی حامل اصلاحات سے نہیں۔ ترقی کی حوصلہ افزا رفتار اور اسلوب سے بھی نہیں۔ اس کا ماحصل دو لفظوں میں یہ ہے کہ ۵۸ کے انقلاب نے ہمیں کن فکری پیمانوں سے روشناسی کے مواقع عطا کیے ہیں۔ یا ترقی و اصلاحات کے اس پورے نقشے میں کن انقلابی تصورات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، اور خوش حالی، کامرانی اور سالمیت و استحکام کی کن بنیادوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جن پر بھروسہ کر کے ہم آگے چل کر زندگی کی پُرشکوہ اور باوقار عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔

لیکن ذرا ٹھہریے۔ اس سے پہلے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس انقلاب نے ہمارے سوچنے کے انداز میں کیا خوش گوار تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ہمیں اس سوال کو نظر و بصر کے سامنے لانا ہوگا کہ ہماری نفسیات کا سانچہ کیسا ہے۔ کن مسائل کو ہم غور و فکر کا ہدف ٹھہراتے ہیں اور ان کے لیے کس نوع

کا اسلوب اظہار عموماً پسند کرتے ہیں۔ بغیر کسی مبالغہ آرائی اور منطقی بھول بھلیاں میں پڑے اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم سیاسیات، تہذیب و ثقافت اور خالص اقتصادی و حیاتیاتی مسائل کے بارہ میں بھی رومان پسندی کا بری طرح شکار ہیں۔ حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت ہمارا شعار ہے ہم ٹھوس استدلال سے کہیں زیادہ ان باتوں کو پسند کرتے ہیں جو کھوکھلے نعروں پر مشتمل ہوں، جن میں کبھی الفا نہ ہونے والے وعدے ہوں۔ نظریہ بازی کی شعبدہ طرازیاں ہوں، خطابت ہو اور زورِ بیان کی جادوگری ہو۔ ہم ان مسائل کا سامنا کرنے سے عمداً گھبراتے ہیں جن سے ہم فی الحقیقت دوچار ہیں اور چاہتے ہیں کہ محض خوش کن الفاظ، عمدہ تراکیب اور فصیح و بلیغ بیانات سے کام بن جائے اور اصل مسائل سے کسی طرح پیچھا چھوٹے۔

ہمارے ذہن کی یہ ساخت اس تاریخی حقیقت کی رہین ہے کہ ماضی میں ہم نے صدی ڈیڑھ صدی تک تقریباً، انگریزی استعمار کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ ظاہر ہے اس طویل عرصے میں "جذباتیت" ہماری زندگی کا تابناک پہلو رہا ہے۔ اس دور میں طبعاً ہمیں ایسے شعلہ مقال خطیبوں اور شیوہ بیان مقرروں کی ضرورت رہی ہے جو انگریزوں کے خلاف تمام ہندوستان میں بغاوت کی آگ بھڑکا دیں۔ جو اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے دلوں کو گرما دیں۔ طبائع میں اشتعال پیدا کر دیں اور ایسے کرداروں کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوں جو اجنبی اقتدار سے بلا محابا ٹکرا جائیں، اور عزم و ارادہ کی بے پناہ قوتوں سے استعمار کے قلعوں میں شگاف ڈال دیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آزادی کی اس صبر آزما اور طویل جدوجہد میں ہم سرخرو ہوئے، اور مجاہدین آزادی کی تقریروں اور قربانیوں سے پورے ہندوستان میں انگریز کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، یہی نہیں یہ پاکستان کے نام سے ایسی مملکت قائم کرنے میں بھی بالآخر کامیاب رہے جس میں رہ کر اور رچ بس کر ہم اپنے پرانے تہذیبی و دینی خواب کو بغیر کسی مزاحمت کے پورا کر سکیں۔ ظاہر ہے تاریخ کے یہ دونوں مرحلے دو مختلف النوع نفسیات اور سرگرمیوں کے خواہاں ہیں۔ جہاں غلامی اور جدوجہد کے دور میں ہمیں جذباتیت کی ضرورت تھی وہاں آزادی کے دور میں جن حقیقی اور ٹھوس مسائل و مشکلات سے ہمیں واسطہ پڑا ہے ان کے حل کی خاطر ہمارے لیے تحمل، عقل و خرد، تحلیل و تجزیہ اور منصوبہ بندی کے تقاضے کہیں زیادہ اہم اور شائستہ التفات ہونا چاہئیں۔ لیکن افسوس

یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی ہمارے ہاں ذہن نہیں بدلا، اور تاریخ کے ان دو مرحلوں میں فرق و انتیاز کے جو بیّن حدود ہیں ان کو ہم سمجھ نہیں پائے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اب بھی ایک نعرہ شورش بپا کر سکتا ہے۔ ایک پھبے دار تقریر راہِ راست سے بہکا سکتی ہے اور آج بھی ایک غوغائی (Demagogue) اس پوزیشن میں ہے کہ رائے عامہ کے صاف ستھرے چشمہ کو گدلا کر دے۔

یہ ہیں وہ حالات جن کی روشنی میں ہم انقلاب کی روح کو صحیح معنوں میں سمجھ سکتے ہیں۔ ان دس سالوں میں پہلی دفعہ ہم نے جذباتی اور مجمل نعروں سے الگ ہو کر اپنے حقیقی مسائل کی طرف عنانِ توجہ کو مڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ پہلی دفعہ اس اہمیت کے ساتھ مسئلے ہمارے سامنے آئے ہیں کہ ان کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ مثلاً یہ کہ ہمارے ملک کے اسّی فی صد لوگ دیہات میں بستے ہیں جن کی تمام تر زندگی کا انحصار زراعت پر ہے۔ لہذا اولین فرصت میں ہمیں زراعت کو ترقی دینا ہے۔ زمین کی ان بیماریوں کو دور کرنا ہے جن کی وجہ سے ہمارے زرعی قطعات روز بروز سمٹ رہے ہیں اور نشوونمو کی صلاحیتوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ جاگیرداری کے فرسودہ اور غلامانہ دستور کو ختم کر کے ایک ایسے نظامِ معیشت کی طرح ڈالنا ہے جو کسانوں کے حوصلے بڑھا دے۔ ان کا معیارِ زندگی بلند کر دے اور ان کی سیاسی و ثقافتی زنجیروں کو کاٹ کر رکھ دے جو جاگیرداری نظام نے ان کے پاؤں میں ڈال رکھی تھیں۔ زرعی اصلاحات اس طرزِ فکر کو اجاگر کرنے کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے نہ صرف کسانوں کی حالت زار سنوری ہے ملکی پیداوار میں بڑی حد تک اضافہ ہوا ہے بلکہ معاشرہ میں ایک نئے باب کا آغاز بھی ہوا ہے، اور ترقی و ارتقا کی نئی سمتیں بھی نظر واہ کے سامنے آئی ہیں۔

اسی طرح پہلی دفعہ ہم نے صنعتی ارتقا کی اہمیتوں کو کما حقہ جانا ہے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ ہمارے گرد و پیش کی مغربی دنیا صنعت و حرفت کے میدان میں اس حد تک آگے نکل گئی ہے کہ اگر ہم نے زندگی کے اس پہلو میں خاطر خواہ ترقی نہ کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم سیاسی آزادی کے باوجود صنعتی اور اقتصادی طور پر مغرب کے غلام بن کے رہ جائیں گے۔ ہمیں صرف درآمدات پر اکتفا کرنا پڑے گا، اور ہمیشہ اس پوزیشن پر قناعت کرنا ہو گی کہ مغرب کی بھاری بھرکم مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خام مواد فراہم کرتے رہیں اور بس۔

معاشی انحکام ہی کے سلسلہ میں ان دس سالوں میں ہماری توجہ بار بار اس ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی کہ زرعی اور صنعتی ارتقا کی تمام کوششیں اس وقت تک بارآور ہونے والی نہیں جب تک ان کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کے خطرات سے ہم آگاہ نہ ہوں، اور کوئی ایسی سبیل اختیار نہ کریں کہ جس سے اس خطرہ پر قابو پایا جا سکے۔ فیملی پلاننگ کا اشکال صرف ہمارا ہی اشکال نہیں بلکہ تمام ان ممالک کا اشکال ہے جہاں پیداوار کی صلاحیتیں محدود ہیں اور آبادی کا دباؤ زیادہ ہے۔ اس کو کسی نظریہ نے جنم نہیں دیا۔ نہ اس میں اقوامِ مغرب کی کسی چال یا دسیسہ کاری ہی کو دخل ہے۔ اس کا تعلق ایک حیاتیاتی مجبوری سے ہے جو نہایت ہی مختصر الفاظ میں یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ ہمارے ملک کا رقبہ بہرحال محدود ہے اور کاشت اور پیداوار کی صلاحیتیں بھی محدود اور معین ہیں، لیکن انسانی آبادی کی وسعتیں غیر محدود ہیں۔ اس صورت میں اگر انسانی آبادی اور پیداوار میں توازن برقرار نہ رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمام کوششیں رائگاں جائیں گی جو معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کے لیے اس اثنا میں اختیار کی جا رہی ہیں۔ یہ مسئلہ خالص اقتصادی اور معاشی نوعیت کا ہے۔ اگر ہم بیماریوں کی روک تھام کرتے ہیں اور اسے نظامِ فطرت میں مداخلت قرار نہیں دیتے، دریاؤں اور سیلابوں کے آگے بند باندھتے ہیں اور اس کو رضائے الٰہی کی مخالفت پر محمول نہیں کرتے تو کوئی وجہ نہیں کہ آبادی اور پیداوار کے درمیان عدمِ توازن کو روکنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھایا جائے تو وہ منشائے الٰہی کے خلاف ہو۔

ان دس سالوں میں اس مسئلہ کی اہمیت کو خاص طور پر واضح کیا گیا ہے اور عملاً ایسی مثبت اور آسان تدابیر اختیار کی گئی ہیں کہ جن سے آبادی کے اس بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پایا جا سکے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو دیانتداری سے مسئلہ کے حل کی یہ صورت نہ بھائے لیکن اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ یہ اشکال ہمارے معاشرہ کا نہایت ہی اہم اشکال ہے اور اس کے حل کے لیے ہمہ جہتی سائنٹفک بنیادوں پر پروگرام بنانا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پہلی حکومتوں نے زراعت کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں کی، اور ہمارے معاشی ارتقا کے لیے انڈسٹری کو رواج نہیں دیا۔ یا آبادی کے پھیلاؤ کے اس خطرہ کو سرے سے محسوس ہی نہیں کیا۔ ہمارا دعویٰ صرف یہ ہے کہ انقلاب کے صرف ان دس سالوں میں ہمیں محسوس ہوا ہے کہ ہمارے سوچنے

سکے انداز میں کیا خامی تھی۔ ہم نے پہلی دفعہ بنیادی اور غیر ضروری مسائل میں فرق و امتیاز کی لکیروں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور پہلی دفعہ ان مسائل پر جن کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے اس حیثیت سے غور کیا ہے کہ ان کو سائنس، علم اور تحقیق و تجزیہ کی روشنی میں حل کیے بغیر ہم کسی صحت مند معاشرہ کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ گویا اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اس انقلاب نے ہمیں اصل مسائل کو پہچاننے اور سلجھانے کے سلسلے میں حقیقت پسندانہ اسلوب فکر بخشا ہے۔

قرارداد مقاصد سے پہلے، اور اس کے بعد یہ حقیقت بہرحال طے تھی کہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہے، لہٰذا اسلام کے علاوہ اور کوئی نظریہ حیات، کوئی آئیڈیالوجی، اور اسلوب یہاں رواج نہ پا سکے گا۔ یہ بات ہمارے ذہنوں میں پوری طرح عیاں تھی کہ یہاں ہمیں ایک ایسی تہذیبی انفرادیت کو جنم دینا ہے جس کی تشکیل و پرورش میں اسلام ہی کے زریں اصول کارفرما ہوں۔ مگر یہ تہذیبی انفرادیت کیا ہے؟ اور کیونکر ظہور پذیر ہو سکتی ہے؟ اس سے متعلق ہمارا شعور واضح نہ تھا۔ اتنا تو ہم جانتے تھے کہ ہمیں اپنے ماضی سے، اپنی تاریخ سے اور اپنی فقہ سے بالش و نمو کی بہت سی مقدار لینا ہے اور ان کی روشنی میں حال کی تعمیر نو کا فریضہ ادا کرنا ہے لیکن تہذیب و ثقافت کے اس تیسرے بُعد (Dimension) سے بڑی حد تک ہم ناآشنا تھے کہ تعمیر و ترقی کی دشواریوں کا سائنس اور ٹیکنالوجی سے کیا تعلق ہے۔ دس سال کے اس عرصہ میں بار بار جس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ اسی نکتہ پر مرکوز رہی ہے کہ جب تک ہم سائنس اور موجودہ ٹیکنالوجی کا مطالعہ نہیں کریں گے، ذہن و فکر کے سانچے کو سائنسی نہیں بنائیں گے اور ان تہذیبی و تمدنی مشکلات کو تدبیر، ہوش اور صبر و تحمل سے حل نہیں کر پائیں گے، جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا سے انسانی معاشرہ میں ابھر آئی ہیں، اس وقت تک احیائے اسلام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم جس دین کو مانتے ہیں وہ حد درجہ حکیمانہ اور دانش افروز ہے۔ اس نے نہ صرف عقل و دانش کے تقاضوں کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اور بحیثیت مسلمان کے ہمارے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ہم کائنات میں تعقل و تعمق کو آزمائیں اور علم و حکمت کی نعمتوں کو عام کریں۔ اور اسی تعلیم کا فیضان تھا کہ ہم نے طبیعیات، طب، ہیئت،

اور فلسفہ و ریاضی میں چند ہی صدیوں کے اندر اندر اپنے علم و ادراک کی دنیا پر دھاک بٹھا دی۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے پھر ہمیں غور و فکر کی دعوت دی ہے اور جدید علوم و فنون سے پھر ہمیں پنجہ آزمائی کے لیے للکارا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس چیلنج کو قبول کریں۔

آخر میں اجازت دیجیے کہ بنیادی جمہوریت کے بارہ میں ہم اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ اس نظام نے ہمیں فکر و نظر کے بالکل ہی نئے اسلوب سے روشناس کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب تک پارلیمنٹی انداز حکومت کے سوا ہمارے سامنے اور کوئی انداز نہ تھا کہ جس کو ہم اپنی سیاسی و قومی امنگوں کی تکمیلوں کا ذریعہ ٹھہرا سکیں۔ تجربہ نے ہمیں بتایا کہ یہ انداز یکسر فرسودہ، بے جان اور غیر مفید ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بات ہماری تخلیقی روایات کے منافی ہے کہ ہم محض بربنائے تقلید اس سے چمٹے رہیں۔ ہمیں اس کے برعکس ایسے سیاسی اور تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت تھی جو ووٹ دینے کی آزادی کے ساتھ ہمارے عوام میں سیاسی شعور پیدا کر سکے، انھیں عملی تربیت دے سکے، ان میں تنظیمی صلاحیتیں بیدار کر سکے، اور اس احساس کی تخلیق کر سکے کہ یہ کاروبارِ حکومت میں شریک ہیں۔ یعنی ضرورت اس چیز کی تھی کہ ووٹ کی آزادی کے پہلو بہ پہلو انھیں ان جمہوری اختیارات سے بہرہ ور کیا جائے کہ جن کی بدولت ان کی شخصیت نکھر سکتی ہے اور ان کی توانائیاں ملک و ملت کے صحیح معنوں میں کام آ سکتی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بنیادی جمہوریتوں کا یہ نظام مزید ترقی و اصلاح کی کوششوں کا رہینِ منت نہیں۔ ہمارا دعویٰ صرف یہ ہے کہ یہ جمہوریت کا نیا اور حوصلہ افزا تجربہ ہے۔ مستحکم اور تعمیری سیاسیات کی طرف ایک کامیاب قدم ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جمہوریت کا یہ تصور کسی بنے بنائے اصول پر مبنی نہیں بلکہ ہمارا اپنا ہے اور ہمارے فلسفۂ حیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔